ڈاکٹر زیب النساء سرویا
گورنمنٹ اسلامیہ گریجوایٹ کالج برائے خواتین ، کوپر روڈ لاہور

Dr. Zeb-Un-Saroya
Govt. Islamia Graduate College for Women, Cooper Road, Lahore

تعمیر شخصیت میں خودی کا بنیادی کردار

The Role of Self in Personality Development

Abstract: Personality encompasses an individual's mental, physical, and behavioral traits, reflecting his internal and external attributes, values, actions, and emotions. While external beauty may capture temporary attention, it is one's character that truly defines them. Thoughts and ideas play a pivotal role in shaping one's character, with the internal nature, lifestyle, and thinking directing the overall personality. Each dimension of personality holds positive and negative values, with self-determination and consciousness emphasized by Iqbal for personality development. Life revolves around self-realization, understanding the environment, and attaining divine knowledge. Self-consciousness serves as the starting point of human life, fostering strength through desire, action, and love. Selflessness is essential for overcoming obstacles and achieving personal growth. Obedience to God and the Messenger, along with self-control, are highlighted for self-training. This leads to the highest level of personality perfection as a divine representation.

Keywords: Khudi, Personality, Love, Aims, Time and Space, Struggle, Action Development

ہر فرد کی شخصیت مختلف جہتوں کی حامل ہوتی ہے۔ شخصیت کی ہر جہت میں دو قدریں ہوتی ہیں۔ مثبت اور منفی۔اقبال نے شخصیت کی قدروں کی تعمیر میں خودی کے کردار کو اہم گردانا ہے۔''خودی'' فارسی زبان کا لفظ ہے جس کے دو معانی ہیں۔ایک خود کا شعور، دوسرا خود کا حد سے بڑھا ہوا احساس، جس کا دوسرا نام تکبر یا غرور ہے۔اول الذکر کو یزدانی خودی اور موخر الذکر کو شیطانی خودی کہتے ہیں۔ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی رقم طراز ہیں:

''شیطانی خودی کا نمونہ روزِ اول ابلیس نے پیش کیا تھا۔ بایں ہمہ دعوائے عبادت و عبودیت اس معبود حقیقی اور آمر مطلق کے حکم کی سرتابی کی۔ نخوت و تکبر کے باعث اس نے اپنی اور آدم کی تخلیق میں امتیازات قائم کیے اور اس کی انانیت خودی نے اسے سجدہ کرنے کی توفیق نہ ہونے دی۔یہی خودی انسان میں پیدا ہوتی ہے تو اسے تکبر ورعونت اور غرور کا پتلا بنا دیتی ہے وہ اپنے ہم جنسوں کو تحقیر کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اپنے قائم کردہ امتیازات کی وجہ سے گمراہی سے دوچار ہو جاتا ہے۔ایسا انسان فرائض حیات اور منزلوں سے دور ہو جاتا ہے۔جب کے دوسری خودی جسے ہم یزدانی خودی سے تعبیر کرتے

ہیں، اس کی معرفت انسان کو خصائص رزیلہ سے محفوظ رکھتی ہے اور سیّات اعمال سے پناہ دیتی ہے۔ یہ فرد کو فرائض سے آگاہ کر کے بندۂ خدا اور مرد باخدا بنا کر خلیفۃ اللہ فی الارض کا اہل بناتی ہے۔ اس خودی کا حصول انسان کا مقصدِ زندگی ہے اور یہی اسلام کی تعلیم ہے۔"(۱)

علامہ اقبال کی فکر کے جملہ مباحث کا محور یہی فلسفۂ خودی ہے۔ انھوں نے اس نظریہ کو تسلسل اور تواتر سے متنوع انداز سے پیش کیا ہے، ماضی قریب و بعید میں کوئی ایسی انفرادی اجتماعی کاوش نظر نہیں آتی، جس نے خودی کو اس تفصیل سے موضوع بحث بنایا ہو۔ اقبال اسی فلسفہ کی روشنی میں فرد کی شخصیت کی تعمیر چاہتے ہیں۔ اقبال کا فلسفہ خودی برسوں کے غور و فکر کے ساتھ پروان چڑھا۔ اس کا محرک کوئی فوری جذبہ نہیں تھا جیسا کہ اقبال کے ایک خط سے اس امر کا واضح اظہار ہوتا ہے کہ قیام یورپ کے دوران شخصیت کی تعمیر کے فلسفہ کے نقوش ابھرنا شروع ہو چکے تھے۔ ۱۸ اکتوبر ۱۹۱۵ کو لسان العصر اکبر الہ آبادی کے نام ایک خط میں رقم طراز ہیں:

> "مذہب بغیر قوت کے محض فلسفہ ہے۔ یہ نہایت صحیح مسئلہ ہے اور حقیقت میں مثنوی لکھنے کے لیے یہی خیال محرک ہوا۔ میں گزشتہ دس برسوں سے اسی پیچ و تاب میں ہوں۔"(۲)

اقبال نے شخصیت کی تعمیر میں خودی کو جسے ہم فلسفۂ حیات سے تعبیر بھی کر سکتے ہیں، بے حد اہمیت دی ہے۔ دراصل اقبال کے فلسفہ خودی یا پیغام کی تخلیق کا خاص پس منظر ہے۔ قیام یورپ کے زمانے میں انھوں نے فلسفے کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ ایران کی مختلف ادبی اور لسانی تحریکوں اور ادب کا بنظر غائر مطالعہ کیا تو اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ اسلامی تہذیب کی ابتری بالخصوص جنوبی ایشیا میں مسلمانوں کی بربادی کا سبب وہ فارسی شاعری بھی ہے جس نے افلاطونی فلسفے کی موشگافیوں میں پھنس کر زندگی کے سرچشمے خشک کر دیے۔ اس کے بعد سکون اور بے عملی کو عین حیات کا مقصد سمجھا جانے لگا۔ افراد سے خودی اور خودداری کی بو جاتی رہی اور ذلت و نکبت باعث فخر سمجھی جانے لگی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس روگ نے آہستہ آہستہ پوری قوم کے رگ و ریشے میں سرایت کر لی۔ پھر اردو ادب بھلا اس سے مستثنیٰ کیوں کر ہو سکتا تھا۔ ایک تو فارسی شاعری کا اثر دوسرا یہ کہ یہ سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد، اس دیس کے عام حالات کے باعث جو صدیوں کی غلامی میں بسر کر چکا تھا اور اہمسا اور تاگ جس کی رگوں میں رچا بسا تھا، اس مجہولیت نے بھیانک شکل اختیار کر لی۔ اقبال نے اس مجہولیت کے خلاف جہاد کیا اور ناتوانوں کی رگوں میں خون اور عمل کی برقی لہر دوڑا دی۔

اگرچہ اقبال سے قبل اردو کے دو ممتاز شاعر الطاف حسین حالی اور اکبر الہ آبادی اپنی شاعری کے ذریعے مسلمانوں کو مرعوبی و مایوسی سے نجات دلانے اور ان میں خودداری اور خود اعتمادی پیدا کرنے کی کوشش کر چکے تھے۔ حالی پر سوز و پر درد سنجیدہ لہجے میں اور اکبر شریفانہ پیرائے میں، لیکن بقول ڈاکٹر عابد حسین:

> "ان دونوں بزرگوں کی نظریات کی تہ تک نہ پہنچی۔ انھوں نے بیمار قوم کا مرض تو تشخیص کر لیا لیکن اس مرض کا سبب نہ پہچان سکے۔ اکبر نے مسلمانوں کے تنزل کا باعث یہ قرار دیا کہ وہ اپنے مرکز یعنی مذہب سے منحرف ہو گئے اور حالی نے یہ کہا کہ وہ اجتہادِ فکر اور وسعتِ نظر چھوڑ کر تقلید پرست اور تنگ خیال بن گئے۔ مگر دونوں میں سے کسی نے یہ نہیں بتایا کہ آخر ان کے مرکز سے منحرف ہونے یا تقلید و تعصب اختیار کر لینے کی وجہ کیا تھی۔ اس کی وجہ معلوم کرنے کے لیے اقبال کے فلسفیانہ نظریہ کی ضرورت تھی۔(۳)

اقبال نے دیکھا کہ ملت کے افراد روحانی تعیش، کاہلی اور بے عملی کا شکار ہو چکے ہیں۔ انھوں نے وحدت الوجود کے غیر اسلامی عقیدہ کو زندگی کا حصہ بنالیا ہے جس کے نتیجے میں وہ قوتِ عمل کھو چکے ہیں۔ انھیں اس کا ایک ہی حل نظر آیا کہ انھیں بے عملی کے رویے کو ختم کرنے اور سعی و عمل کی ترغیب دی جائے۔ اس لیے کہ شخصیت کی تعمیر اور استحکام عمل ہی سے ممکن ہے اور عمل شعورِ ذات اور تعینِ ذات کے بغیر ناممکن ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> '' خودی کا لفظ اقبال کے پیغام یا فلسفہ حیات میں تکبر و غرور یا اردو فارسی کے مروجہ معنوں میں استعمال نہیں ہوا۔ خودی اقبال کے نزدیک نام ہے احساس کا اپنی انا کو جراحت و شکست سے محفوظ رکھنے کا، حرکت و توانائی کو زندگی کی ضامن سمجھنے کا، مظاہراتِ فطرت سے برسرِپیکار رہنے کا اور ایک دوسرے کو سہارا تلاش کرنے کی بجائے اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کا۔ یوں سمجھ لیجیے کہ اقبال کے نقطہ نظر سے ''خودی'' کی زندگی کا آغاز، وسط اور انجام سبھی کچھ ہے۔''(۴)

اقبال نے اپنے پہلے شعری مجموعہ ''اسرارِ خودی'' کے دیباچہ میں اسی حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ لذتِ حیات انا کی انفرادی حیثیت اس کے اثبات، استحکام اور توسیع میں مضمر ہے وہ لکھتے ہیں:

> ''شاعرانہ تخیل محض ایک ذریعہ ہے اس حقیقت کی طرف توجہ دلانے کا کہ لذت حیات ''انا'' کی انفرادی حیثیت اس کے اثبات، استحکام اور توسیع سے وابستہ ہے۔ یہ لفظ اس نظم میں بامعنی استعمال نہیں کیا گیا جیسا کہ عام طور پر اردو میں مستعمل ہے۔ اس کا مفہوم محض ''احساسِ نفس'' یا ''تعین ذات'' ہے۔ مرکب لفظ بے خودی'' میں بھی اس کا یہی مفہوم ہے۔
>
> فریق قلزم وحدت دم از خودی نزند
>
> بود محال کشیدن میان آب نفس '' (۵)

ایسے ہی'' رموزِ بے خودی'' کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

> ''جس طرح حیات افراد میں جلب منفعت و فع مضرت تعین عمل و ذوق حقائق عالیہ احساسِ نفس کے تدریجی نشو و نما اس کے تسلسل توسیع و استحکام سے وابستہ ہے۔ اسی طرح ملل و اقوام کے حیات کا راز بھی اسی احساس یا بالفاظ دیگر ''قومی انا'' کی حفاظت، تربیت اور استحکام میں مضمر ہے۔ اور حیاتِ ملیہ کا انتہائی کمال یہ ہے کہ افراد قوم کسی آئین مسلم کی پابندی سے آزادی جذبات کے حدود مقرر کریں تاکہ انفرادی اعمال کا تبائن و تناقض مٹ کر تمام قوم کے لیے ایک قلب مشترک پیدا ہو جائے۔ افراد کی صورت میں احساس نفس کا تسلسل قوتِ حافظہ سے ہے۔ اقوام کی صورت میں اس کا تسلسل و استحکام قومی تاریخ کی حفاظت سے ہے۔ گویا قومی تاریخ حیات ملیہ کے لیے بمنزلہ قوت حافظہ کے ہے جو اس کے مختلف مراحل کے حسیات و اعمال کو مربوط کرکے ''قومی انا'' کا زمانی تسلسل محفوظ و قائم کو رکھتی ہے۔''(۶)

''خودی'' کا لفظ فارسی میں خود پرستی اور نخوت وغیرہ غرور کے لیے مستعمل رہا ہے۔ علامہ نے اس کو نہایت وسیع معنوں میں استعمال کیا۔ بقول عبدالشکور احسن: '' اقبال نے اس کو نہایت وسیع معنی پہنائے ہیں جن کے ذریعے انھوں نے ذاتِ انسان کی بے پناہ قوت و استعداد اور اور کائنات سے اس کے رشتے پر روشنی ڈالی ہے۔'' (۷)

خودی کا سرِّ نہاں لاالٰہ الااللہ		خودی ہے تیغ فساں لاالہ الااللہ (۸)

دراصل خودی ایک بہت سادہ سی فطری شے ہے، جسے ہم بآسانی عرفانِ ذات کہہ سکتے ہیں۔ اپنے آپ کو پہچاننا، اپنی حد میں رہنا، اپنے نفس کی معرفت، تزکیہ، اس کی ترقی، شخصیت کی تعمیر، جوہر ذاتی کی پرورش، کردار کی تشکیل و تہذیب ہر باہوش انسان کا حق بھی ہے اور فرض بھی۔ جب تک فرد کی اپنی اہمیت اور قدر و قیمت اس پر آشکار نہ ہو، کائنات میں اس کی حیثیت متعین نہیں ہو سکتی اور وہ زندگی میں اپنا حصہ نہیں پا سکتا اور نہ ہی اپنے مقصد تخلیق کو پورا کر سکتا ہے۔ یہ بات بہ ظاہر جتنی آسان ہے در حقیقت اتنی ہی مشکل ہے۔ بسا اوقات حالات و واقعات آدمی کی عقل پر پردہ ڈال دیتے ہیں، ماحول کے رسوم و رواج آئینۂ قلب کو زنگ آلودہ کر ڈالتے ہیں۔ کبھی ضروریات حیات اور کبھی خواہشات، تمنائیں اور آرزوئیں طبیعت کو منتشر کر دیتی ہیں اور شعور کو ناقص بنا دیتی ہیں۔ ایسی حالت میں انسان اپنی حقیقت کو بھول جاتا ہے۔ اس کا ضمیر مردہ ہو جاتا ہے، ہمت اور بصیرت کھو جاتی ہے۔ آدمی ایک بے جان، بے روح ہیولے اور پرزے کی طرح حوادث کا کھلونا اور دوسروں کا آلہ کار بن جاتا ہے، یا تو وہ ساکت پڑا رہتا ہے یا خود کار مشین کی طرح متحرک رہتا ہے۔ نہ کوئی عزم، نہ ارادہ، نہ مقصد حیات، نہ کوئی منزل۔ یہ خودی کی یہ موت ہے جو زندگی پر ایک ضرب ہے اور پوری کائنات کے لیے باعث نقصان۔ آدمِ خاکی نہ نوری ہے نہ ناری۔ وہ اس خطۂ ارضی نائب حق ہے، اس کی جنت اس کے خونِ جگر میں پنہاں ہے۔ محاورۃً ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ دنیا کو فردوس بنانے کے لیے تخلیق کیا گیا ہے، اس کے عروج کی کوئی حد بندگیِ رب کے سوا نہیں، معراج رسول خاتم النبین ﷺ کے نقشِ قدم پر چل کر وہ ستاروں سے آگے جا سکتا ہے۔ اس تسخیر کائنات کی کلید عرفانِ ذات ہے کہ مقولہ ہے:

''جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اپنے رب کو پہچان لیا۔''

رب رب العالمین ہے اور ختم الرسل حضرت محمد خاتم النبین ﷺ رحمۃ للعالمین۔ خدا پروردگارِ عالم ہے تو انسان رحمتِ عالم۔ یہ منصب بلند آفاق کی وسعتوں کے ساتھ ساتھ نفس کی گہرائیوں میں ڈوبے بغیر نہیں مل سکتا۔ یہ ایک نصب العین ہے جس کو پیش نظر رکھ کر ہر فرد، ہر ملت اور پوری انسانیت ارتقا کی ناپیدا کنار منزلوں کے حصول کی خاطر رواں دواں رہتی ہے:

ازل اس کے پیچھے، ابد سامنے		نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے (۹)

یہ خیالی فلسفہ نہیں ہے بلکہ یہ تاریخی حقیقت ہے جس کو نظر انداز کرنا فرد اور ملت دونوں کے لیے نقصان دہ ہے۔
اس کے بغیر نہ تو کوئی فرد خود کو سنبھال سکتا ہے اور نہ ہی کوئی سماج زندہ و تابندہ رہ سکتا ہے۔
ڈاکٹر عبدالمغنی لکھتے ہیں:

''جو شخص اور جو قوم زندگی کے راستے میں آگے نہیں بڑھے گی وہ بالآخر پیچھے ہٹے گی۔ پیش قدمی بقا ہے اور پس ماندگی فنا۔ دنیا میں بقا و فنا کے درمیان کوئی برزخ نہیں، یا تو عمل کی جنت ہے یا بے عملی کا جہنم۔ عمل صالح سے خودی کی حقیقی پرورش ہوتی ہے، جو محنت کی تعمیر میں معاون ہے۔۔ اس

کے برخلاف صرف انانیت کا مظاہرہ ایک فریب ہے اور ایغو کا چکر ایک مغالطہ۔ لاشعور کا معمہ بھی ناقابلِ حل ہے۔ صحیح شعورِ ذات کے ساتھ تعمیری سرگرمی ہی خودی کا اصلی مطمعِ نظر ہے۔'' (۱۰)

اقبال کے نزدیک کائنات عالم کا ذرہ ذرہ نشۂ خودشناسی میں سرشار ہے حتیٰ کہ ننھا منا بچہ تک احساس خودی میں ڈوبا ذوق جست جو میں سرگرم نظر آتا ہے لیکن انسان نیرنگ عالم کے فریب میں بھٹک کر خود سے بیگانہ ہو چکا ہے۔ جب کہ زندگی خودی کا احساس کرنے، ماحول کو جاننے اور معرفت الٰہی کے حصول کا کا نام ہے۔ آخری دو کے حصول کے لیے احساس نفس اور شعور ذات مقصد اولین بن جاتا ہے۔ لیکن مشرق و مغرب اس راز سے بے خبر ہیں۔ اسی بے خبری کی وجہ سے اُنھوں نے ایسی اشیا کو اپنی توجیہات کا مرکز بنالیا ہے جو ان کو راہِ راست سے بھٹکاتی ہیں۔ خودی کے بغیر تمام دنیاوی علوم و فنون بے فائدہ اور بے کار ہیں:

اے کہ ہے زیر فلک مثل شرر تیری نمود　　کون سمجھائے تجھے کیا ہیں مقاماتِ وجود
گر ہنر میں نہیں تعمیرِ خودی کا جوہر　　وائے صورت گری و شاعری و نالے و سرود
مکتب و میکدہ جز درس نبودن ندہند　　بودن، آموز کہ ہم باشی و ہم خواہی بود　(۱۱)

افسوس موجودہ تہذیب و تمدن نے فرد کو اسرارِ خودی سے دور کر دیا ہے، جب کے حقیقت یہ ہے کہ خودشناسی ہی شخصیت کو مستحکم کر کے اقوام عالم کی قیادت کرنے کے قابل بناتی ہے۔ یہی وجہ ہے کے اسلام عرفان خودی کی تعلیم دیتا ہے۔ عارف خودی کے سامنے ساری دنیا جھکتی ہے۔ وہ بے پناہ قوتوں کا حامل ہوتا ہے۔ کائنات کی ہر شے اس کے تصرف میں آجاتی ہے اور اس کے اشاروں پر عمل پیرا دکھائی دیتی ہے اور بقول طاہر فاروقی ''وہ ایک چشمِ زدن میں زمانہ کو منقلب کر سکتا ہے۔ مکان ولامکاں سب جگہ اسی کا ڈنکا بجتا ہے۔''(۱۲) لیل و نہار سب اس کے حکم کے تابع ہو جاتے ہیں:

رمزِ دین مصطفیٰ ﷺ دانی کہ چیست　　فاش دیدن خویش را شاہنشہی است　(۱۳)
بے ذوقِ نمود زندگی موت　　تعمیر خودی میں ہے خدائی
رائی زورِ خودی سے پربت　　پربت زورِ خودی سے رائی　(۱۴)
جس بندۂ حق بیں کی خودی ہو گئی بیدار　　شمشیر کی مانند ہے برندہ و براق　(۱۵)

یہ امر بھی پیشِ نظر رہے کہ عارف خودی کو وہ زندگی میسر آجاتی ہے جس کی سرحد موت سے ماورا ہوتی ہے اور موت کا اس کو فنا کرنا ممکن نہیں:

زندگانی ہے صدف، قطرۂ نیساں ہے خودی　　وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کر نہ سکے
ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی　　یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے　(۱۶)

معرفتِ خودی چند لمحوں میں حاصل ہو جانے والی چیز نہیں۔ گو کبھی کبھی یہ عرفان ایک برقی تجلی کی طرح اچانک کسی مردِ باخدا کے ذریعے طاری ہو سکتا ہے لیکن ایسے حالات کبھی کبھار ہی پیدا ہوتے ہیں۔ عام طور پر یہ کیفیت کوشش کے بعد ملتی ہے مگر اس کے لیے بھی اسباب کا یک جا ہونا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شخصیت کے استحکام اور بقا کے لیے اقبال حرکت و عمل جدوجہد اور قوت کے حصول کو لازم قرار دیتے ہیں کہ اس کی بدولت

خودی اپنے مقصد میں حائل ہونے والی قوتوں پر غلبہ حاصل کرتی ہے اور اپنی قوتوں کا اظہار کرتی ہے اور یہ خود اظہاری یا ''وانمودن خویش'' سے اطمینان حاصل کرتی ہے۔ اقبال اپنی صلاحیتوں سے آشنا ہونے اور انھیں بروئے کار پر زور دیتے ہیں۔ حکیم احمد شجاع لکھتے ہیں:

> ''جو شخص اپنی استعداد ہی سے واقف نہیں، وہ اپنی خودی کے مقام کا تعین نہیں کر سکتا اور جو شخص اپنی خودی کے مقام کی تعین سے قاصر ہو، اس کی جستجو ایک تہمت ہے اور اس کا مدعا ایک افترا۔ عمل ہی سے زندگی کی تشکیل ہوتی ہے، عمل میں زندگی کا اظہار ہے۔ مگر عمل قویٰ کی استعداد پر منحصر ہے اور اسی استعداد کی تعیین، تعیینِ ذات ہے جس کو اقبال نے ''خودی'' کے نام سے موسوم کیا۔'' (۱۷)

گویا ہر شخص کو چاہیے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو پہچانے، اپنی استعداد کو بیدار کرے اور عمل کو مقصودِ زندگی جانے۔ خودی کا مطلب یہ نہیں کہ انسان خود کو بڑی تقدیر کا اہل سمجھ کر اس مدعا کے حصول کی کوشش کرے جو اس کی دسترس سے باہر اور اس کی قوت حصول سے بالاتر ہو۔ فرد پر لازم ہے کہ وہ مسلسل جدوجہد کرتا رہے کی یہ شخصیت کے بقا اور استحکام کے لیے لازم ہے۔ اقبال ''شذرات'' میں لکھتے ہیں:

> ''شخصیت انسان کا عزیز ترین سرمایہ ہے۔ لہٰذا اسی کو خیر مطلق قرار دینا چاہیے اور اپنے تمام اعمال کی قدر و قیمت کو اُسی معیار پر پرکھنا چاہیے۔ خوب ہے وہ جو شخصیت کے احساس کو بیدار رکھے اور ناخوب وہ ہے جو شخصیت کو دبانے اور بالآخر ختم کر دینے کی طرف مائل ہو۔ اگر ہم وہ طرزِ زندگی اختیار کریں جس سے شخصیت کو تقویت پہنچے تو دراصل ہم موت کے خلاف نبرد آزما ہیں۔ پس شخصیت کی بقا ہمارے اپنے اختیار میں ہے۔ اس کے حصول کے لیے جدوجہد ضروری ہے۔''(۱۸)

اقبال نے شذرات میں جگہ جگہ قوت کا ذکر کیا ہے جو اس امر کا غماز ہے کہ اقبال کے نزدیک فلسفہ ''خودی'' کا اولین محرک حصولِ قوت کی ترغیب ہے۔ زمان و مکان خودی کی ہمہ جہت قوت کے آئینہ دار ہیں۔ خودی خود شکن بنی تو اجزاو جود میں آئے۔ زمان و مکان خودی کے اظہارِ قوت کی جولان گاہ ہیں۔ خودی قوت کی مدد سے قطرے کو گہر بنا ڈالتی ہے۔ جب کہ ضعفِ خودی مئے ارغوانی کو پیکر سے محروم کر دیتی ہے اور وہ بقا کے لیے ساغر کا سہارا تلاش کرنے لگتی ہے۔ پہاڑ اگر خودی سے غافل ہو جائے تو وہ منتشر ہو کر صحرا کا روپ اختیار کر لیتا ہے جب کہ موج اپنا تحفظ کر کے بحر و بر کے دوش بحر پر سوار ہو کر حکمرانی کرنا جانتی ہے۔

چون حیات عالم از زور خود یست   پس بقدر استواری زندگیست   (۱۹)

اقبال نے زندگی کی قدر و قیمت کا تعین قوت کی نسبت سے کرتے ہوئے قوت کو خودی کا لازمی خاصہ قرار دے کر فلسفۂ قوت اور مذہب میں ایک خاص ارتباط جنم دیا ہے۔ اقبال نے خودی اور قوت کے آپس کے تعلق کا واضح انداز میں ذکر کرنے کے بعد تخلیق مقاصد کو خودی کی حیات کے لیے لازمی قرار دیا ہے۔

شہیدِ جست جو رہنا اور یکے بعد دیگرے آرزوؤں کو جنم دیتے رہنا گویا مسلسل مقاصد کی تخلیق کرنا ہے۔ تخلیق مقاصد حقیقت میں شعور ذات یا خودی کا نور ہے۔ یہ نور زندگی کو تابندگی بخشتا ہے اور محبت اس کو پائندہ و تابندہ بنا دیتی ہے۔ تخلیق مقاصد کی شعاعیں انسان کا سینہ روشن رکھتی ہیں۔ اقبال طلب کی شدت پر زور دیتے ہیں کہ ایک تمنا کی تکمیل، پھر دوسری آرزو کی برآوری تیسری آرزو کی تخلیق کا سبب بن جائے اور بہتر سے بہتر کی

تلاش۔ پھر یہ طلب ذوق اور شوق آرزو دنیائے آب و گل سے آگے بڑھ کر نئے نئے جہاں ڈھونڈے۔ ایسے جہاں جو نظروں سے پوشیدہ ہیں لیکن خودی کا مسافر سعی و عمل سے ان کو پالیتا ہے۔

آرزو کی شدت ہی تخلیق کا سبب ہے۔ آرزو نہ ہو تو یہ مشت خاک حرارت سے محروم ہو جائے۔ دل کی دھڑکنیں سوز آرزو ہی سے قائم ہیں۔ اسی سے خودی میں ہنگامہ آرائی کا سلیقہ جنم لیتا ہے۔ ہمارے اندر لذت دیدار کی مسلسل خلش تھی تو اس نے آنکھ کی شکل اختیار کر کے تسکین پائی۔ کبک میں شوخی رفتار کی آرزو انگڑائیاں لے رہی تھی، وہ اس کے پاؤں کی صورت میں جلوہ گر ہوئی۔ بلبل کا سینہ نغموں کے اظہار کے لیے بے تاب تھا تو اس بے تابی اور اضطراب نے منقار کی شکل پائی۔ غرض کہ زندگی کی اٹھان اور بانکپن کا راز لذت آرزو میں مضمر ہے اور آرزو ہی جہان رنگ و بو کی روح ہے۔ قوموں کی زندگی، ان کے آئین و رسوم، ان کے علم و حکمت یہ سب اس آرزو کا نام ہیں جس نے اپنی قوت اظہار کی مدد سے دل کی دنیا سے نکل کر ایک مجسم شکل اختیار کر لی ہے۔ ہمارا مادی پیکر، ہمارا فکر و تخیل، ہمارا شعور و فہم یہ سب وہ آلات ہیں جو زندگی نے عالم پیکار میں اپنے دفاع کے لیے ترتیب دیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ نے علم و فن کو "پیش خیزان حیات" اور "رازدانان زندگی" کے نام سے یاد کیا ہے اور اپنے مخاطب کو ذوق آرزو سے سرشار ہونے کی تلقین کی ہے۔ زندگی کا راز مقصد و آرزو ہی کی تخلیق میں پوشیدہ ہے۔

آرزو کو پانے کی صورت یہ ہے کہ انسان غیر خود یعنی اپنے طبعی ماحول سے مسلسل جنگ کرتا رہے۔ یہ اس طرح ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے لیے نئے نئے مقاصد متعین کرتا ہے اور انھیں حاصل کرنے کی سعی میں سرگرم رہتا ہے۔ اس میں اسے اپنے ماحول میں تصرف کرنا، اپنی راہ سے رکاوٹوں کو دور کرنا اور مشکلات کا مقابلہ کر کے ان پر غالب آنا پڑتا ہے۔ اس طرح اس کی ذہنی اور عملی قوتیں برابر تیز ہوتی رہتی ہیں اور اس کے سینے میں خودی کی آگ روز بروز زیادہ مشتعل ہوتی جاتی ہے۔ یہ سوزِ آرزو طالبِ خودی کو دم بھر چین نہیں لینے دیتا۔ ایک مقصد کے حاصل ہوتے ہی وہ ایک بلند تر مقصد کے حصول کی کوشش کرنے لگتا ہے اور اسی طرح راہِ طلب میں آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس بے قراری اور بے چینی، اس سعیِ پیہم اور جہدِ مسلسل کا نام زندگی ہے۔ سکون خواہ بہشت کا سکون ہی کیوں نہ ہو، روحِ انسانی کے لیے موت ہے۔(۲۰)

خودی کی منازلِ ترقی اس عالمِ زمان و مکان کی تسخیر پر ختم نہیں ہوتیں۔ شاعر کی چشمِ تخیل انسان کے جہد و عمل کے لیے اس کے ماورا نئے نئے میدان دیکھتی ہے۔

خودی کی یہ ہے منزل اولیں	مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں
تری آگ اس خاک داں سے نہیں	جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں
بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر	طلسم زمان و مکاں توڑ کر
جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود	کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ وجود
ہر اک منتظر تیری یلغار کا	تری شوخی فکر و کردار کا (۲۱)
قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر	چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا	ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا	کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں (۲۲)

قرآن خیال کی بجائے عمل پر زور دیتا ہے کیوں کہ عمل یا جوشِ کردار تقدیر کے راز کھولتا ہے اور انسان مسلسل عمل سے اس کائنات کو مسخر کر سکتا ہے۔اقبال نے بھی عمل کی اہمیت کو مختلف طریقوں سے بیان کیا ہے۔

راز ہے راز ہے تقدیر جہانِ رنگ وتاز — جوشِ کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز
جوشِ کردار سے شمشیرِ سکندر کا طلوع — کوہِ الوند ہو جس کی حرارت سے گداز
جوشِ کردار سے تیمور کا سیلِ ہمہ گیر — سیل کے سامنے کیا شے ہے نشیب اور فراز
صفِ جنگاہ میں مردانِ خدا کی تکبیر — جوش کردار سے بنتی ہے خدا کی آواز (۲۳)

اقبال کے نزدیک بے عملی کی زندگی خودی کے حق میں موت کا حکم رکھتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے ان تمام نظریوں اور فلسفہ ہائے زندگی کی مذمت کی ہے جو بے عملی کی ترغیب دیتے ہیں۔خودی کی سعی پیہم اور ارتقا کے دوران ایک چیز جو اسے آگے بڑھانے میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے اسے اقبال نے کبھی آرزو کہا ہے اور کبھی عشق کا نام دیا ہے۔ارتقائے خودی میں عشق یا آرزو سب سے بڑا محرک ثابت ہوتی ہے۔اگر آرزو نہ ہو تو عمل وجود میں نہیں آسکتا۔

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولین ہے عشق — عشق نہ ہو تو شرع و دیں بت کدۂ تصورات (۲۴)

یہ آرزو محبت کا جز ہے۔عشق بغیر آرزو کے وجود میں آ ہی نہیں سکتا۔آرزو جب شدت اختیار کرتی ہے تو ہم اس کو عشق کا نام دیتے ہیں اور عشق کی نوعیت کا تعین آرزو ہی کرتی ہے۔اقبال نے عشق کے کئی مدارج اور کئی مقامات بیان کیے ہیں :

عشق فقیہِ حرم، عشق امیرِ جنود — عشق ہے ابن السبیل، اس کے ہزاروں مقام (۲۵)

چنانچہ کہیں عشق جمالی صورت اختیار کرتا ہے اور کہیں جلالی رنگ میں اپنی جھلک دکھاتا ہے اور کہیں فنونِ لطیفہ کی تخلیق کا باعث بنتا ہے۔

عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گل تابناک — عشق ہے صہبائے خام، عشق ہے کاس الکرام
عشق کے مضراب سے نغمۂ تار حیات — عشق سے نورِ حیات، عشق سے نار حیات
رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت — معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود
قطرۂ خونِ جگر، سل کو بناتا ہے دل — خونِ جگر سے صدا، سوز و سرور و سرود (۲۶)
نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر — نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر (۲۷)

خام کاروں کو عشق خود فراموشی اور از خود رفتگی کا سبق دیتا ہے مگر پختہ کاروں کو خود شناسی اور خودداری کا درس دیتا ہے۔ایک لافانی نصب العین کی محبت فانی انسان کی خودی کی تکمیل کرکے اسے بھی لازوال بنا دیتی ہے۔

مردِ خدا کا عمل، عشق سے صاحبِ فروغ — عشق سے اصلِ حیات، موت ہے اس پر حرام
تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو — عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام
عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا — اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام (۲۸)

جس طرح طلب و ہدایت کے لیے کسی مردِ کامل کے سامنے سر نیاز جھکانا خودی کو استحکام بخشتا ہے، اسی طرح مال و دولت اور جاہ و مرتبہ کے لیے اقتدار کی طلب خودی کو کمزور کرتی ہے۔فقر و استغنا خودی کی بنیادی شرائط میں سے ہے۔سوال اور گدائی صرف اسی کا نام نہیں کہ مفلس و نادار

دولت مند کا طفیلی بن جائے بلکہ دولت اکٹھی کرنے کا ہر وہ طریقہ جس میں انسان خود محنت و مشقت کر کے نہ کمائے بلکہ دوسروں کی محنت سے فائدہ اٹھاتا رہے، اقبال اسے بھی گداگری ہی سمجھتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ حکمران بھی جو غریبوں کی کمائی پر زندگی گزارتا ہے، سوال اور دریوزہ گری کا مجرم ہے۔

تخلیقِ مقصد اور مسلک عشق شخصیت کو استحکام اور دوام بخشتے ہیں، جب کہ سوال شخصیت کو کمزور اور ناتواں کرتا ہے۔ سوال انسان کی بلند فکر کو چھینتا ہے اور اس کی رفیع سوچ کو تبدیل کر کے خودی کی نفی پر اکساتا ہے۔

اقبال کا خیال ہے کہ خودی کی نفی کا فلسفہ مغلوب قوموں کی ایجاد ہے۔ وہ یہ مسلک اختیار کر کے چپکے چپکے اقوام غالب کے اخلاق کو کمزور بناتی ہیں۔ کمزور اپنی ذات کے تحفظ کے لیے حیلہ جوئی سے کام لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غلامی میں قوت تدبیر بہت بڑھ جاتی ہے۔ نفی خودی کا فلسفہ اپنانے سے دل تقاضائے عمل کی تکمیل کے قابل نہیں رہتا۔ عزم واستقلال رخصت ہو جاتے ہیں اور اقتدار و اعتبار ختم ہو جاتا ہے۔ قوت سے محرومی خوف جان اور پستی ہمت کا سبب بنتی ہے اور پھر روبہ زوال قومیں جسمانی اور روحانی تنزل کو تہذیب کے نام سے یاد کرنے لگتی ہیں۔ نفی خودی کے سلسلے میں علامہ کا نظریہ ہے کہ مسلم اقوام کے مسلک تصوف اور ادبیات پر افلاطون (۳۴۷ق۔م) کا گہرا اثر ہے جسے وہ نفی خودی کا حامل و علم بردار قرار دیتے ہیں۔ علامہ کو شکوہ ہے کہ افلاطون آج بھی ہمارے تخیلات پر حاوی ہے، حالاں کہ اس کے افکار قوت عمل اور طاقت سے محرومی کا سبق دیتے ہیں۔ افلاطون کی نظر میں تو زندگی کا راز موت میں پوشیدہ ہے، اور عالم اسباب محض ایک افسانہ ہے۔ ذوق عمل سے محروم ہونے کی وجہ سے اس نے نیستی کو ہستی اور ہستی کو نیستی قرار دیا ہے۔ (۲۹) بقول اقبال اس کے فلسفہ نے محض خواب و سراب کا تانا بانا بُن کر زندہ حقیقتوں کو نظر انداز کر دیا۔ اس کے دوررس اثرات نے متاثرہ قوموں پر گہرا تخریبی اثر ڈالا اور انھیں ذوق کردار سے محروم کر دیا:

گفت سرِ تا زندگی در مردن است — شمع را صد جلوہ از افسردن است (۳۰)

فکر افلاطون زیان را سود گفت — حکمتِ اور بود نابود گفت (۳۱)

تخلیق مقاصد اور عشق سے شخصیت کو اثبات اور استحکام حاصل ہوتا ہے اور سوال اس کے لیے موت کا پیغام ہے۔

اب تک کی بحث سے یہ بات بالکل واضح ہو گئی ہے کہ اقبال کے نزدیک خودی کی استواری کے لیے عشق اور آرزو لازمی ہیں۔ عشق خودی کی ماہیت ہے کہ خودی اپنے ارتقا سے عشق ہے۔ اقبال کے نزدیک پیغمبروں کا کام بھی خودی کو عجز میں تبدیل کرنا نہیں رہا بلکہ رسولِ مقبول ﷺ کی طرح غارِ حرا میں اپنی خودی کو استوار کرنے کے بعد تعلیم اور محبت کے ذریعہ عوام کی خودی کی تربیت کرنا رہا ہے، تاکہ کائنات میں عشق کے ذریعہ ایک وسیع قلبی تعلق پیدا ہو کر خودی کی وحدت قائم ہو سکے۔ اقبال کے نزدیک خودی کی تربیت اور اس کی استواری کے تین مراحل ہیں:

اطاعتِ الٰہی خودی کی تادیب اور تہذیب کا پہلا مرحلہ ہے۔ اس میں خودی کو اسی قانونِ حیات کی پابندی کا عادی بنایا جاتا ہے جو خالقِ عالم نے اپنی مخلوقات کے لیے مقرر فرمایا ہے۔ اسی مرحلہ میں خودی اپنے اختیارات کو خداوند تعالیٰ کے اختیارات کے مطابق بناتی ہے تاکہ جبر و اختیار کا فرق مٹ جائے۔ ظاہر ہے کہ آئین کی اطاعت سے اختیار قوی ہو جاتا ہے اور خود ہی اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی منشا کے مطابق ڈھال کر زیادہ قوی اور توانا محسوس کرتی ہے۔

ضبطِ نفس خودی کی تربیت کا دوسرا مرحلہ ہے۔ خودی جب اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے احکام کے تابع کر لیتی ہے اور اپنے اختیارات کو اللہ تعالیٰ کے اختیارات کے مطابق بنا لیتی ہے تو اس کے اندر ایک قوت اور توانائی تو ضرور پیدا ہو جاتی ہے لیکن وہ نفسانی خواہشات ابھی پوری طرح زیر نہیں ہو چکیں جن کی سرکشی کی کوئی حد نہیں ہے اور اس کی دِقت بھی خودی کو بے راہ کر سکتی ہیں۔ خصوصاً غیر اللہ سے محبت اور خوف کے جذبات تو اسی قدر قوی

ہوتے ہیں کہ کسی لمحہ بھی مضبوط سے مضبوط خودی پر منہ زور سیلاب کی طرح ٹوٹ پڑنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اسی لیے اسی مرحلہ میں ان نفسانی خواہشات اور جذبات کو منضبط کرنے پر دھیان دیا جاتا ہے تاکہ یہ جذبات اسی طرح خودی کے قابو میں آجائیں کہ ان کی سرکشی ختم ہو جائے اور ان سے تعمیری کام لیا جا سکے۔

ان دونوں مراحل کو خیر و خوبی کے ساتھ طے کرنے کے بعد خودی کو وہ مرتبہ اور درجہ حاصل ہو جاتا ہے جسے انسانیت کا اوجِ کمال سمجھا جا سکتا ہے۔ اسی مقام کے بارے میں اقبال نے کہا ہے

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے (۳۲)

گویا عبودیت میں گم ہو کر خدا اور بندے کے فرق کو ختم کر دینا نیابتِ الٰہی ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں تَخَلَّقُوا بِاَخْلَاقِ اللّٰہ کا مصداق بنتے ہوئے اخلاق و صفاتِ الٰہیہ کا اپنے آپ میں پیدا کر لینا نیابتِ الٰہی کہلاتا ہے۔ اسی مقام پر پہنچ کر بندہ خدا سے ہم کنار ہوتا ہے اور تسخیرِ کائنات کی خدائی صفات اس کے اندر پیدا ہو جاتی ہیں۔ یہی وہ درجہ ہے جسے حاصل کرنا ارتقائے خودی کا بلند ترین نصب العین ہے اور اسی کو حاصل کر کے انسان خلیفۃ اللہ کے حقیقی منصب پر فائز ہوتا ہے اور اسی کی تلاش میں نوعِ انسانی ہزارہا سال سے سرگرم سعی ہے اور اسی کے انتظار میں کائنات جانے کب سے بے قرار ہے۔

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا
رونق ہنگامۂ ایجاد شو در سوادِ دیدہ ہا آباد شو
نوعِ انساں مزرع و تو حاصلی کاروانِ زندگی را منزلی
سجدہ ہائے طفلک و برنا و پیر از جبینِ شرمسارِ ما بگیر (۳۳)

تاریخ میں مثبت اور مستحکم خودی کی امثال موجود ہیں جن کی پیروی کر کے جدید دور کا انسان اپنی شخصیت کو مستحکم کر کے سربلند ہو کر جی سکتا ہے۔ اقبال نے اپنی تحریروں میں انسانی خودی کے مستحکم عملی نمونے پیش کیے ہیں۔ انھوں نے انبیا علیہم السلام کی سیرتوں کی مختلف جہات کو نمایاں کیا ہے اور بنی نوعِ انسان کو ان کی پیروی کی تلقین کی ہے تاکہ وہ خلیفۃ اللہ فی الارض کا فریضہ بطریق احسن سرانجام دے سکے۔

انسانی خودی کے تاریخی نمونوں میں حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ ورجوع، حضرت نوح علیہ السلام کی انتھک تبلیغ توحید، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بت شکنی و آتش نشینی، حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اطاعت اور تسلیم و رضا، حضرت یعقوب علیہ السلام کا صبر، حضرت یوسف علیہ السلام کا عصمت کا تحفظ، حضرت داؤد علیہ السلام کا پر تاثیر نغمۂ توحید، حضرت سلیمان علیہ السلام کی غیر معمولی سلطنت نے بھی عاجزی و خاک ساری، حضرت موسیٰ علیہ السلام و حضرت ہارون علیہ السلام کی حق کے لیے جنگ و جدل، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پیامِ محبت اور حضرت محمد ﷺ جامع سیر الانبیا ہر لحاظ سے قابلِ تقلید ہیں۔

خودی کے مردِ کامل خیر البشر حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں۔ ان کی شخصیت میں یقیناً خدا کی محبت جوہرِ اصلی ہے مگر اس جوہر کو چمکانے اور عالم تاب بنانے والا عنصر اطاعت الٰہی ہے۔ معرفتِ نفس، محبتِ خالق، اطاعت خدا اور خدمتِ خلق کی ترکیب سے تسخیرِ کائنات اور ارتقائے حیات کی راہیں ہموار اور منزلیں سر ہوتی ہیں۔ اس سلسلے میں خیر البشر حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ، آل رسول اور اصحاب رسول ﷺ کی زندگیوں کے تاریخی نمونے پوری انسانیت کا مشترک ورثہ ہیں جن کی تقلید فرد کی شخصیت کو مستحکم کرتی اور کامیابی سے ہم کنار کرتی ہے۔

اقبال نے نمرود، فرعون، ابو جہل، ابو لہب، میر جعفر اور میر صادق وغیرہ کو اپنے کلام میں منفی خودی کی حامل شخصیات کے طور پر پیش کیا ہے اور ان سے احتراز کی تلقین کی ہے کہ یہ اور ان جیسے افراد معاشرے میں انتشار اور خودی کے زوال کا باعث ہیں۔ خودی کا زوال فرد اور جماعت کا زوال ہے اور یہ زوال اقبال کو گوارا نہیں۔

حوالہ جات

۱۔ محمد طاہر فاروقی ، پروفیسر۔ سیرتِ اقبال۔ لاہور: گوہر پبلی کیشنز، س۔ن۔ ص ۲۶۵

۲۔ عطااللہ، شیخ۔ (مرتب)۔ اقبال نامہ۔ (حصہ دوم)۔ لاہور: شیخ اشرف 1951ء۔ ص ۴۵

۳۔ عابد حسین، ڈاکٹر، سید۔ اقبال کا تصورِ خودی۔ مشمولہ۔ اردو اقبال نمبر۔ نئی دہلی: انجمن ترقی اردو۔ اکتوبر ۱۹۳۸ء۔ ص ۲۰

۴۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر۔ اقبال سب کے لیے۔ لاہور: الوقار پبلی کیشنز۔ ۲۰۰۶ء۔ ص ۹۲،۹۱

۵۔ محمد اقبال۔ دیباچہ مثنوی اسرارِ خودی۔ مشمولہ۔ مقالاتِ اقبال۔ مرتب ــ عبدالواحد معینی، سید۔ لاہور: القمر انٹر پرائزز۔ 2011ء۔ ص ۱۹۸، ۱۹۹

۶۔ ایضاً۔ ص ۲۳۳

۷۔ عبدالشکور احسن، ڈاکٹر۔ خودی۔ مشمولہ۔ دائرہ معارف اقبال۔ جلد دوم۔ لاہور: پنجاب یونی ورسٹی اورینٹل کالج۔ ۲۰۱۰ء۔ ص ۲۹۸

۸۔ محمد اقبال۔ ضربِ کلیم، مشمولہ، کلیاتِ اقبال اردو۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان۔ طبع یازدہم۔ 2011ء۔ ص ۵۲۷

۹۔ محمد اقبال۔ بالِ جبریل، مشمولہ، کلیاتِ اقبال اردو۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان۔ طبع یازدہم۔ 2011ء۔ ص ۴۵۵

۱۰۔ عبدالمغنی، ڈاکٹر۔ اقبال کا نظریہ خودی۔ جہلم: بک کارنر۔ ۲۰۱۶ء۔ ص: ۱۶

۱۱۔ محمد اقبال۔ ضربِ کلیم، مشمولہ، کلیاتِ اقبال اردو۔ ص ۶۲۶

۱۲۔ محمد طاہر فاروقی، پروفیسر۔ سیرتِ اقبال۔ ص ۲۶۷

۱۳۔ محمد اقبال۔ پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق مع مسافر۔ کلیاتِ اقبال فارسی۔ لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز۔ طبع ششم۔ ۱۹۹۰ء۔ ص ۸۵۴

۱۴۔ محمد اقبال۔ بالِ جبریل، مشمولہ، کلیاتِ اقبال اردو۔ ص ۳۸۳

۱۵۔ محمد اقبال۔ ضربِ کلیم مشمولہ، کلیاتِ اقبال اردو۔ ص ۵۸۸

۱۶۔ محمد اقبال۔ ضربِ کلیم مشمولہ، کلیاتِ اقبال اردو۔ ص ۵۴۳۔

۱۷۔ حکیم احمد شجاع۔ اقبال کے نظریۂ خودی کا صحیح مفہوم۔ مشمولہ۔ مطالعہ اقبال (مرتبہ) گوہر نوشاہی، لاہور: بزمِ اقبال۔ طبع دوم۔ ۱۹۸۳ء۔ ص ۲۱۶

۱۸۔ افتخار احمد صدیقی۔ (مترجم)۔ شذرات فکر اقبال۔ لاہور: بزمِ اقبال۔ ۱۹۷۳ء۔ ص ۷۷

۱۹۔ محمد اقبال۔ اسرارِ خودی۔ ص ۱۴

۲۰۔ عبدالشکور احسن، ڈاکٹر۔ خودی ، مشمولہ۔ دائرہ معارف اقبال۔ جلد دوم۔ ص ۲۹۹

۲۱۔ محمد اقبال۔ بالِ جبریل، مشمولہ، کلیاتِ اقبال اردو۔ ص ۴۵۷، ۴۵۶

۲۲۔　ایضاً۔ ص ۴۹۰
۲۳۔　ایضاً۔ ص ۴۷۹
۲۴۔　ایضاً۔ ص ۴۳۹
۲۵۔　ایضاً۔ ص ۴۲۱
۲۶۔　ایضاً
۲۷۔　ایضاً۔ ص ۴۲۸
۲۸۔　ایضاً۔ ص ۴۲۰
۲۹۔　عبدالشکور احسن، ڈاکٹر۔ خودی، مشمولہ۔ دائرہ معارف اقبال۔ جلد دوم۔ ص ۲۹۹
۳۰۔　محمد اقبال۔ اسرارِ خودی۔ ص ۳۲
۳۱۔　ایضاً۔ ص ۳۳
۳۲۔　محمد اقبال۔ بالِ جبریل، مشمولہ، کلیاتِ اقبال اردو۔ ص ۳۸۴
۳۳۔　محمد اقبال۔ اسرارِ خودی۔ ص ۴۶